صنفِ قصیدہ: شعریات، تہذیب، تاریخ

ظفر احمد صدیقی*

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں ادب، تاریخ، تہذیب، معاشرت بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں دورِ جدید کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعبوں سے قطع نظر بہ طور خاص ادب میں نئے خیالات ونظریات کی ترویج و اشاعت کا نقطۂ آغاز محمد حسین آزاد کے خطبات اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ بعد کے ناقدین، مورخین ادب اور دیگر اہلِ قلم عموماً ان کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اخلاص اور نیک نیتی میں کوئی شبہہ نہیں۔ لیکن ادب کے مابعد استعمار مطالعے کے نتیجے میں اب یہ احساس عام ہو چلا ہے کہ مشرقی علوم وفنون اور کلاسیکی ادب کے ردّ وقبول اور تعینِ قدر سے متعلق ان کے فیصلے استعماری قوتوں کے زیر اثر بلکہ انھیں کی تعلیم وتلقین پر مبنی تھے۔ لہٰذا بہ حیثیت مجموعی یہ جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے اور راہِ صواب سے دور تھے۔ بہ طور مثال صنف قصیدہ سے متعلق حالی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

> قصیدے میں صرف چند معمولی سرکل ہیں جن میں ہمیشہ ہمارے شعرا شبدیزِ فکر کو کاوے دیتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے زیادہ شاعری کے جوہر دکھانے چاہے تو وہ مدح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے جس میں یا تو فصل بہار کا ذکر ہوتا ہے (اگر چہ اس وقت خزاں ہی کا موسم ہو) مگر اس ذکر میں اس ناپاک دنیا کی فصل بہار سے کچھ بحث نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور عالم سے بحث ہوتی ہے جو عالمِ امکان سے بالاتر ہے، یا زمانہ، آسمان، نصیب یا قسمت کی شکایت ہوتی ہے جس کو درحقیقت خدا کی شکایت سمجھنا چاہیے جو زمانے کی آڑ میں خوب دل کھول کر کی جاتی ہے۔ ----- یا ایک فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف، اس کے جور وظلم کی شکایت اور اپنے شوق وانتظار کا مسلسل یا غیر مسلسل بیان اس طرح کیا جاتا ہے، جیسا کہ عشقیہ مثنویوں یا غزل میں ہوتا ہے یا فخر وخودستائی میں تمام تمہید ختم کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو، بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض مداح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ عدالت میں ماخوذ ہو جائے

* پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، بھارت

تو قصیدے میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اس کا جرم ثابت ہو سکے [۱]۔

اسی طرح امداد امام اثر کاشف الحقائق میں رقم طراز ہیں:

> درحقیقت اردو کے بیشتر قصائد ایک تنگ دائرہ خیال میں محدود پائے جاتے ہیں، خاص کر وہ قصائد جو درباری رنگ رکھتے ہیں۔ ایسے قصائد کے مضامین ہمیشہ ان خیالات پر مشتمل ہیں جن کو نہ کوئی راست باز، صحیح مزاج، شریف آدمی زبان پر لا سکتا اور نہ راست باز صحیح مزاج، شریف آدمی سن سکتا ہے [۲]۔

اثر کے اس بیان پر ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بہت عمدہ گرفت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> اثر کا یہ خیال۔۔۔۔جذباتیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ ان خیالات کو زبان پر لانے والوں اور سننے والوں میں اگر سب نہیں تو زیادہ تر لوگ اپنے زمانے کے راست باز، صحیح المزاج اور شریف آدمی تھے [۳]۔

حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی اصنافِ ادب کو ان کے صحیح تناظر اور ادبی روایت کے سیاق و سباق میں دیکھنے سمجھنے اور پڑھنے پرکھنے کا رجحان محمد حسن عسکری کی دین ہے۔ بہ قول انتظار حسین مرحوم:

> ان کے مضامین میں ہم ایسے تنقیدی شعور کو بنتے سنورتے دیکھتے ہیں جو مغرب کی ادبی روایتوں سے بھی سیراب ہوتا نظر آتا ہے اور مشرق کی ادبی روایات اور مشرقی فکر کی آگاہی سے مالا مال بھی ہے [۴]۔

عسکری کی اس روایت کو آگے بڑھانے والوں میں دوسرا اہم نام شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ انھوں نے داستان اور غزل کی شعریات سے متعلق اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیں اپنی ادبی روایت کا صحیح معنوں میں عرفان عطا کیا ہے۔

قصیدہ جو فارسی و اردو کی مشہور صنف سخن ہے، اس کی اساس اور سرچشمہ اگرچہ عربی قصیدہ ہے لیکن واضح رہے کی عربی قصیدہ اپنے مفہوم و مدلول کے لحاظ سے فارسی و اردو قصیدے سے مختلف ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ کلاسیکی عربی میں شاعری کی تین ہیئتیں رائج رہی ہیں:

۱۔ رجز یا اُرجوزہ۔ اس کی جمع اراجیز ہوتی ہے۔ یہ چند مصرعوں پر مشتمل نظم ہوتی تھی جس کے تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے۔ یہ زیادہ تر بحر رجز میں نظم کی جاتی تھی۔ مصرعوں کا وزن کبھی مستفعلن تین بار اور کبھی مستفعلن دو بار ہوا کرتا تھا۔ رجز کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس کی بنیاد شعر کے بجائے مصرعوں پر ہوتی تھی۔ اسی لیے اس کے تمام مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری تھا۔ اردو میں رجز جنگی فخر و مباہات کو کہتے ہیں، لیکن عربی رجز میں موضوع کی کوئی قید نہ تھی۔ اس میں فخر، مدح، ہجو، رثا، غزل وغیرہ کوئی بھی موضوع نظم کیا جا سکتا تھا۔ عرب مورخین و ناقدین کے مطابق یہ عربی شاعری کی سب سے پہلی منزل اور سب سے پہلی ہیئت تھی۔

۲۔ قِطعہ یا مُقطَّعہ (جمع مُقطَّعات) دس یا سات یا اس سے کم اشعار کی مختصر نظم کو کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا رائج تلفظ بہ فتح اول قَطعہ ہے۔ عربی میں یہ رجز کے بعد شاعری کی دوسری منزل اور دوسری ہیئت تھی۔ رجز کے برخلاف اس کی بنیاد مصرعوں کے بجائے مکمل شعر پر تھی۔ اس میں بحر یا موضوع کی کوئی قید نہ تھی۔ البتہ اشعار کا ہم قافیہ ہونا ضروری تھا۔ رجز کی طرح قطعہ میں بھی

مدح، ہجو، فخر، رثا، غزل وغیرہ کوئی بھی موضوع اختیار کیا جا سکتا تھا۔

۳۔ قصیدہ۔ یہ عربی شاعری کی تیسری منزل ہے۔ عربی میں قصیدہ ان طویل نظموں کو کہتے ہیں جن کے ابیات کی کم از کم تعداد قطعات سے متجاوز ہو۔ اصطلاحی طور پر اس کا تقابل کبھی رجز اور قطعہ دونوں سے ہوتا ہے اور کبھی صرف قطعہ سے۔

مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ عربی میں قطعہ کی طرح قصیدہ بھی محض ایک ہیئت کا نام ہے جس کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عربی میں ایک ہی نظم پر موضوع کے لحاظ سے مرثیہ یا غزل اور تعداد ابیات کے لحاظ سے قصیدے کا اطلاق کیا جاتا ہے یعنی غزلیہ قصیدے اور رثائیہ قصیدے کی اصطلاحیں بھی رائج ہیں۔ دورِ جدید میں اس کے مدلول میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی ہے اور اسے اردو کی اصطلاح نظم کا مرادف بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ نظم معرّا، سانیٹ اور آزاد نظموں پر بھی قصائد کا اطلاق کرتے ہیں۔

یہاں ایک بحث یہ بھی ہے کہ عربی میں رجز و قطعات کے بالمقابل طویل نظموں کو قصیدہ کیوں کہا گیا؟ مشہور لغت نویس ابنِ منظور نے اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں۔ ذیل میں ابنِ منظور کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

۱۔ کہا گیا ہے کہ قصیدہ گو چونکہ قصیدے کے لیے اہتمام کرتا ہے اور عمدہ الفاظ و معانی کی مدد سے اسے مہذب و منقح بناتا ہے اسی لیے اسے قصیدہ کہتے ہیں۔ اس کی اصل قصید بہ معنی مغز غلیظ ہے۔۔۔۔ عرب کلام فصیح کے لیے سمین و فربہ کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں یہ کلام سمین و فربہ ہے یعنی عمدہ کلام ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ یہ شعرِ مُقَصَّد ، ہے جب کہ وہ منقح و مہذب اور پاکیزہ ہو[۵]۔

۲۔ بیان کیا گیا ہے کہ مکمل اشعار [طویل نظم] کو قصیدہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا قائل دل لگا کر اس کی تخلیق کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے فکر و اہتمام کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جو خیال اس کے دل میں گزر جائے اور جو الفاظ بھی اس کی زبان پر جاری ہو جائیں انھیں بلا تکلف قبول کر لے، بلکہ خوب غور و فکر سے کام لیتا ہے اور اسے عمدہ بنانے کی پوری جدوجہد کرتا ہے۔ بدیہہ گوئی نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ قصد بہ معنی ارادہ سے مشتق ہے اور مقصود و مراد کے معنی میں ہے[۶]۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ رجز و قطعات کے بعد قصائد کی شکل میں جب طویل نظموں کا آغاز ہوا تو عربی شعر و ادب کی دنیا میں ایک انقلاب سا آ گیا، ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی گئی اور شعر گوئی کے میدان میں پیش رفت کا اندازہ ہوا۔ اسی احساس کے پیش نظر ان نئی نظموں کو ایسا نام دینے کی فکر دامن گیر ہوئی جو ان کی خوبی و عمدگی کی طرف اشارہ کر سکے۔ اہل عرب جو بادیہ نشین اور اونٹوں کے گوشت پر گزر بسر کرنے والے تھے، ان کے نزدیک موٹا دل دار گودا حسن و خوبی کی علامت تھا۔ اس لیے انھوں نے ان نئی نظموں کا نام قصیدہ تجویز کر کے گویا ان کا حق ادا کر دیا، یا بہ الفاظ دیگر مقصود و مراد بنا کر دکھا دیا۔

عربی قصیدہ کے حوالے سے یہاں چند باتیں اور بھی قابل ذکر ہیں:

۱۔ قصائد کے رواج کے بعد عربی میں شاعری اور قصیدہ نگاری ہم معنی ہو گئی۔ اس لیے کہ ہیئت کے لحاظ سے قصیدہ

ہی سکۂ رائج الوقت تھا اور جو شاعر جس موضوع پر بھی دادِ سخن دینا چاہتا تھا، اسی ہیئت میں اپنی جودتِ طبع کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عربی کا ہر قابلِ ذکر شاعر قصیدہ نگار ہے، لیکن اسی معنی میں کہ وہ رجز یا قطعے کی ہیئت کے بجائے قصیدے کی ہیئت میں ادائے مطالب کرتا ہے۔

۲۔ جب یہ طے ہوگیا کہ عربی میں قصیدہ محض ایک ہیئت کا نام ہے اور اس میں موضوع یا مواد کی کوئی قید نہیں۔ اسی طرح اس کے اجزائے ترکیبی بھی متعین نہیں جن کا تمام تر بلکہ اکثر و بیشتر قصائد میں پایا جانا ضروری ہو تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ عربی میں قصیدے کی کوئی شعریات بھی نہیں۔ چنانچہ عربی میں جہاں صدہا قصائد ایسے ہیں جن میں تشبیب موجود ہے، وہیں فخر، حماسہ، ہجو، رثاء، وصف، عتاب اور اعتذار وغیرہ سے متعلق بہتیرے قصائد ایسے بھی ہیں جن میں تشبیب کا ایک شعر بھی موجود نہیں۔ اسی طرح ایسے قصائد بھی بہ کثرت موجود ہیں جن میں تشبیب تو ہے، لیکن دیگر اجزائے ترکیبی کا کوئی نام و نشان نہیں۔ البتہ مدحیہ قصائد کی نوعیت جداگانہ ہے، جس سے متعلق بعض تفصیلات آئندہ پیش کی جائیں گی۔

۳۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قصیدے کی زبان شاندار اور لہجہ پرشکوہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت، ترکیبوں کی بلند آہنگی، جوش اور جزالت اس کا معیار ہیں، تو اس کا اطلاق و انطباق بھی عربی قصائد پر نہیں ہوتا۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ عربی میں قصیدہ محض ایک ہیئت کا نام ہے جس کا موضوع یا اسلوب بیان سے کوئی اختصاص نہیں۔ اسی لیے عربی قصیدہ نگار جب کوئی قصیدہ نظم کرتا ہے تو خواہ وہ غزل ہو یا مرثیہ، ہجو ہو یا مدح ہر جگہ اس کا اسلوب بیان ایک ہی ہوتا ہے۔ اب اگر شاعر پرشکوہ لب و لہجے کا مالک ہے مثلاً فرزدق تو اس کا غزلیہ قصیدہ بھی پرشکوہ ہوگا اور اگر اس کے اسلوب میں سادگی، سلاست اور شیرینی ہے مثلاً جریر تو اس کے مدحیہ قصائد بھی سہل و سادہ اسلوب میں ہوں گے۔

۴۔ کلاسیکی عربی شاعری کے تین دور زیادہ شہرت و اہمیت کے حامل ہیں۔ (۱) عہد جاہلی (۲) عہد اموی (۳) عہد عباسی۔ ان میں عہد جاہلی کے زیادہ تر قصائد فخر و حماسہ اور دیگر موضوعات سے متعلق ہیں مدحیہ قصائد بہ حیثیت مجموعی کم ہیں۔ ان میں بھی گریز، حسن طلب اور دعا کے اجزا کم کم ملتے ہیں۔ اس کے بعد عہد بنو امیہ میں اگرچہ خلافت، دربار اور دیگر شاہانہ لوازمات وجود میں آجاتے ہیں، تاہم مدح گو شعرا اور مدحیہ قصائد کا زیادہ غلبہ نظر نہیں آتا، بلکہ فخر و مباہات اور ہجو و معارضہ کے قصائد زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح مدحیہ قصائد میں تشبیب و مدح کے علاوہ دیگر اجزائے ترکیبی کا سراغ بھی خال خال ملتا ہے۔ مذکورہ دونوں ادوار کے بعد جب ہم عہد عباسی میں داخل ہوتے ہیں تو اکثر و بیشتر اہم اور بڑے شعرا کو امرا و سلاطین کا طواف کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس طرح عہدِ عباسی میں دیگر موضوعات سے متعلق قصائد کے بالمقابل مدحیہ قصائد کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ نیز ان

میں قصیدے کے اجزاے ترکیبی کا اہتمام بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ان تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قصیدہ اگرچہ عربی میں محض ایک ہیئت کا نام ہے لیکن عربی کے مدحیہ قصائد عہد عباسی تک آتے آتے اجزاے ترکیبی کے اہتمام والتزام کی وجہ سے فی الجملہ ایک صنف کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عربی سے اب ہم فارسی کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔جس طرح غزل کا نام اور اس کی ہیئت عربی سے ماخوذ ہے، لیکن بعض تبدیلیوں کے بعد اس نے صنف کا درجہ فارسی میں حاصل کیا اور فارسی گوشعرا کے ذریعے ہی اس کی شعریات وجود میں آئیں۔اسی طرح قصیدے کا نام، اس کی ہیئت نیز مدحیہ قصائد کے اجزائے ترکیبی اگرچہ شعراے عرب کی دین ہیں، لیکن اس نے باقاعدہ صنف کا درجہ فارسی میں حاصل کیا اور صدیوں کے ارتقا کے دوران اس کی شعریات بھی فارسی شعرا کے ذریعے ہی صورت پذیر ہوئیں۔

اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ایران کے اسلامی قلمرو میں شامل ہونے کے تقریباً تین سو سال بعد جب فارسی میں شعروسخن کی سرگرمیاں از سرِنو شروع ہوئیں تو اس کا آغاز قصائد سے ہوا۔اس کا سبب یہ تھا کہ اس دور میں علمی، ادبی اور تہذیبی زبان عربی تھی اور جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا عربی میں شاعری کی صرف ایک ہی ہیئت نمایاں اور ممتاز تھی اور وہ قصیدے کی ہیئت تھی۔اس لیے شعراے ایران نے اسی کا تتبع کیا۔اس جگہ یہ حقیقت بھی خاطر نشیں رہنی چاہیے کہ اس عہد کے ایرانی و ماوراءالنہری علما، ادبا اور شعرا اہل زبان نہ ہوتے ہوئے بھی عربی دانی میں عربوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔اس لیے شعراے عرب کے طرز پر فارسی قصائد نظم کرنے میں انھیں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔یہاں مثال کے طور پر امیر مُعِزّی کے ایک قصیدے کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔یہ وہ دلکش قصیدہ ہے جس کی تعریف کرتے ہوئے ادبیات فارسی کے نامور محقق مرزا محمد قزوینی رقم طراز ہیں: ایں قصیدۂ فریدہ از شہد وشکر گرومی بردو قندِ طبرزد را بہ ہیچ می نشمرد"[7] اشعار یہ ہیں:

اے ساربان منزل مکن جز در دیار یارمن
تا یک زماں زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن
ربع از دلم پر خوں کنم، خاک دمن گلگوں کنم
اطلال را جیحوں کنم از آب چشم خویشتن
ازروے یار خرگہی ایواں ہمی بینم تہی
وز قدِ آں سروِ سہی خالی ہمی بینم چمن
بر جاے رطل و جام مے گوراں نہا دستند پے
برجاے چنگ وناے ونے آواز زاغ است وزغن
از خیمہ تا سُعدیٰ بشد و زحجرہ تا سلمیٰ بشد

وز حجلہ تا لیلیٰ بشد گوئی بشد جانم زتن
نتواں گذشت از منزلے کا نجا نیفتد مشکلے
از قصۂ سنگیں دلے نوشیں لب وسیمیں ذقن
آنجا کہ بود آں دل ستاں با دوستاں در بوستاں
شد گرگ و روبہ را مکاں شد گور و کرگس را وطن
ابر است بر جاے قمر زہر است بر جاے شکر
سنگ است بر جاے گہر خار است بر جاے سمن

اس قصیدے میں معزّی اپنے ممدوح کو مخاطب کر کے یہ بھی کہتا ہے کہ شعراے عرب کا یہ طرز قصیدہ گوئی 'نغز بدیع' ہے:

مشمر زطبع من زلل مشناس در شعرم خلل
گر من ز ربع و از طلل در مدح تو گویم سخن
نغز بدیع است ایں نمط در دُرج بے سہو و غلط
زانساں کہ در دُرج و سفط یاقوت و دُرّ مختزن

لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ فارسی گو شعرا شعراے عرب کے تتبع کی منزل سے جلد ہی آگے نکل گئے۔ چنانچہ انھوں نے اس صنف میں گونا گوں تجربات کیے، اس کے حدود کو وسیع کیا اور اس کی شعریات کی تشکیل کا اہم کارنامہ بھی انجام دیا۔ فارسی قصائد کے تنوع و رنگارنگی کا کسی قدر اندازہ لگانے کے لیے بہ طور شاہد و مثال محمد بن بدر جاجرمی کی بیاض 'مونس الاحرار فی دقائق الاشعار' کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ۷۴۱ھ میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس کی جلد اول میں جاجرمی نے چودہ ابواب کے تحت فارسی کے ۱۸۷ قصائد جمع کیے ہیں ابواب کے عنوانات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

پہلا باب۔ توحید میں	۷ قصائد
دوسرا باب۔ نعت محمد مصطفیٰؐ میں	۳ قصائد
تیسرا باب۔ حکمت و موعظت و نصیحت میں	۱۲ قصائد
چوتھا باب۔ وصفیات میں	۱۳ قصائد
پانچواں باب۔ مصنوعات میں	۱۲ قصائد
چھٹا باب۔ تقسیمات میں	۸ قصائد
ساتواں باب۔ سوال و جواب میں	۶ قصائد
آٹھواں باب۔ تجنیسات میں	۷ قصائد
نواں باب۔ مسمطات میں	۳ قصائد
دسواں باب۔ ملزومات میں	۵ قصائد

گیارہواں باب۔ توشیحات ومحذوفات میں ۱۱ قصائد
بارہواں باب۔ مربعات میں ۱۰ قصائد
تیرہواں باب۔ قسمیات میں ۱۲ قصائد
چودھواں باب۔ تشبیہات میں ۷۶ قصائد

ان ابواب کے تحت ذیلی تقسیمات بھی ہیں جن کا تفصیلی ذکر یہاں باعث طوالت ہوگا۔ البتہ صرف باب وصفیات کے ۱۲ ذیلی عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ قصیدہ وصف س (یعنی سیمیا) میں
۲۔ قصیدہ وصف ہیئت ونجوم میں
۳۔ قصیدہ وصف بہار میں
۴ قصیدہ وصف آئینہ میں
۵۔ قصیدہ وصف شمع میں
۶۔ قصیدہ وصف چنگ میں
۷۔ قصیدہ وصف آفتاب میں
۸۔ قصیدہ وصف تیغ میں
۹۔ قصیدہ وصف خروس میں
۱۰۔ قصیدہ وصف حمام میں
۱۱۔ قصیدہ وصف لاحشہ (یعنی آش آرد) میں
۱۲۔ قصیدہ وصف شراب میں [۸]

اب جہاں تک قصیدہ کی شعریات کا تعلق ہے تو علامہ شبلی کے تجزیے کے مطابق اس کی ترتیب وتشکیل بھی فارسی قصیدہ گویوں کے ذریعے عمل میں آئی اور وہ اس طرح کہ دور اول کے فارسی قصیدہ نگاروں کی زیادہ تر توجہ سادہ اور صاف خیالات کو سادہ لفظوں میں ادا کرنے کی طرف رہی۔ البتہ ہنرمندی اور کمال فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے انھوں نے صنائع لفظی مثلاً تجنیس، ترصیع، تربیع، تلمیح، توشیح، تضمین، تقسیم، لف ونشر اور اعداد وغیرہ، کا بیش از بیش استعمال کیا۔ اس کے بعد انوریؔ اور ظہیرؔ فاریابی نے مضمون آفرینی، دقت پسندی اور خیال بندی کی طرف توجہ دی۔ یہاں تک کہ ادائے خیالات میں تکلف، آورد اور مبالغہ ہی کمال فن ٹھہرا اور دقیق خیال بندی ہی قصیدہ گوئی کا معیار قرار پائی۔ اس کے ساتھ ترکیب اور بندش میں چستی، بلندی اور زور پیدا کیا گیا اور سیکڑوں نازک تشبیہات ایجاد کی گئیں۔ اس کے بعد خاقانیؔ نے اپنے قصائد میں مختلف علوم وفنون کی تلمیحات واشارات کو برت کر لازمۂ قصیدہ گوئی بنا دیا۔ مذکورالصدر شعرا کے معاصرین نیز ان کے بعد آنے والے شعرا نے امور مذکورہ کو اصول موضوعہ کے طور پر اختیار کر لیا اور انھیں اصولوں کے مطابق صدہا بلکہ ہزارہا قصائد

تیار کردیے۔اس طرح قصیدے کی ایک مخصوص زبان اور ادائے خیالات کا ایک مخصوص طرز قائم ہوگیا، جو غزل، مثنوی اور رباعی وغیرہ دیگر فارسی اصناف سخن سے مختلف تھا، پھر صدیوں تک اس کی پابندی جاری رہی۔ ناقدین انھیں کی تعبیر قصیدے کی شعریات سے کرتے ہیں اس ضمن میں علامہ شبلی کا یہ اقتباس لائق ذکر ہے:

قصیدے کی ایک خاص زبان بن گئی یعنی بندش میں چستی اور زور، الفاظ متین اور پُرشان، خیالات میں بلندی اور رفعت، یہاں تک کہ قصیدہ کے شروع میں جو غزلیہ اشعار ہوتے ہیں۔وہ بھی عام غزل کی زبان سے مختلف ہوتے ہیں۹۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قصیدہ جس کا آغاز عربی میں قبل اسلام ایک ہیئت سے ہوا تھا اور جس نے عہد عباسی میں مدحیہ قصائد کی صورت میں صنف کے اولین نقوش قائم کر لیے تھے، فارسی میں پہنچ کر اس نے باقاعدہ صنف کا درجہ حاصل کر لیا۔وہیں اس کی شعریات مرتب ہوئی اور وہیں یہ صنف اوجِ کمال کو پہنچی۔

اس گفتگو کا اگلا حصہ قصیدے کی علمی، ادبی اور تہذیبی قدر و قیمت سے متعلق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قصائد وہ عربی کے ہوں یا فارسی کے، انھیں ہماری فکری وتہذیبی تاریخ میں روشن مینار کی حیثیت حاصل ہے۔کیوں کہ عربی و فارسی کے بہترین شعرا کی بہترین فکری وفنی کاوشیں اسی ہیئت یا صنف میں موجود ومحفوظ ہیں۔اگر عربی وفارسی ادب سے قصائد خارج کر دیے جائیں تو ان دونوں زبانوں کا سرمایۂ شعروادب اپنی شان کھو بیٹھے گا۔یہاں پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔لکھتے ہیں:

قصیدہ فارسی شاعری کی ایک انتہائی اہم صنف ہے۔قدما اس صنف میں اپنے زورطبع ہی کا نہیں، علم وفضل کا بھی مظاہرہ کیا کرتے تھے۔جب علم نجوم، ہیئت، موسیقی کی اصطلاحوں سے لوگ نا آشنا ہونے لگے اور مذکورہ علوم کی اصطلاحیں ان کے لیے چیستاں بننے لگیں تو اس صنف سخن کو مطعون کیا جانے لگا اور قصیدے کے یہ معنی قرار دیے جانے لگے کہ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں شاعر یا تو دروغ گوئی کا مرتکب ہوتا ہے یا پھر بھٹئی کا۔استادمحترم پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس طلسم کو توڑتے ہو ئے وافر مثالوں کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے کہ قصیدہ ہی واحد صنفِ سخن ہے جو تاریخی ماخذ کے بھی کام آتی ہے اور جس کے مطالعے کے ذریعے شاعر کے زمانے کے تہذیبی سرمائے سے بھی واقف ہوا جا سکتا ہے ۱۰۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالی کی طرح شبلی نے بھی استعماری فکر سے متاثر ہو کر کہیں کہیں فارسی قصیدے کی تخفیف کر دی ہے۔اسی طرح عربی قصیدے سے فارسی قصیدے کے تقابل میں بھی وہ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔چنانچہ پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

ہندوستانی نقاد اور محققوں نے فارسی قصیدہ گوئی کے مطالعے کا حق ادا نہیں کیا، بلکہ اکثر اس

صنف کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کے ذمہ دار ہوئے ہیں۔ میری اپنی نظر میں فارسی قصیدہ گوئی فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس صنف شاعری میں فارسی قصیدہ نگاروں نے نئے نئے موضوعات شامل کیے ہیں۔ کہنے کو تو یہ مدحیہ شاعری ہے اور شاعر کی ساری صلاحیت ممدوح کی شخصیت کی برتری ثابت کرنے پر مرکوز ہوتی ہے، مگر ایسا نہیں، ممدوح تو محض ایک بہانہ ہے۔ شاعر کا مقصد تو اپنے شاعرانہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے لیے قصیدے کا ابتدائیہ جس کو تشبیب کہتے ہیں، نہایت مناسب جگہ ہے۔ اس میں پچاسوں موضوعات پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ کبھی عاشقانہ رنگ کے اشعار لکھے جاتے ہیں جو غزل کی بنیاد ہوتے ہیں۔ کبھی بہار کے تعلق سے رنگ برنگے چھوٹے بڑے موضوع پر اظہار خیال ہوتا ہے۔ فخریہ تو شاعر کا دل پسند موضوع ہے۔ اس میں شاعر طرح طرح سے اپنی خودداری اور خودستائی کے راگ الاپتا ہے۔ غرض اخلاقی مذہبی، عارفانہ، تاریخی، قومی، سیاسی وغیرہ موضوعات پر شاعر کے بے لاگ اظہار خیال کے لیے قصیدے سے بہتر کوئی صنف نہیں اور حق بات یہ کہ فارسی قصیدے موضوعات و مضامین کے تنوع کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس لیے مجھے ان حضرات سے بنیادی اختلاف ہے جو قصیدے کو محض بھٹئی سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ فارسی قصیدہ گو شعرا کی عظمت کے قائل نہیں۔ شبلی نعمانی جیسے نقاد نے بھی فارسی قصیدہ سرائی کے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا[۱۱]۔

اخیر میں اردو قصیدہ نگاری کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شعرائے دکن کی توجہ ابتدا سے سترہویں صدی عیسوی تک صنف مثنوی کی طرف رہی ہے۔ اس کے بعد اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شمالی ہند کے شعرا نے زیادہ تر صنف غزل میں دادِ سخن دی ہے۔ رہا قصیدہ تو اس کی طرف ہمارے شعرا کی توجہ نسبتاً کم رہی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قصیدہ نگاری کے فروغ کے لیے سلاطین و امرا کی سرپرستی، استحکامِ سلطنت، ملک میں خوشحالی و معاشی فارغ البالی اور عہدِ وسطیٰ میں رائج علوم و فنون سے واقفیت بہ منزلۂ شرائط ہیں۔ لیکن شعرائے اردو کو یہ ساز و سامان کما حقہٗ میسر نہ آسکے۔ کیونکہ وہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد عموماً معاشی بدحالی کا شکار رہے۔ اسی لیے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران اردو میں قصیدہ نگاری کے بجائے غزل گوئی کو فروغ حاصل ہوا۔ جیسا کہ خود فارسی میں فتنۂ تاتار کے زمانے میں قصیدہ نگاری موقوف ہو گئی تھی اور شعرا بالعموم غزل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو قصائد نا قابلِ التفات ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حالات کی نامساعدت کے باوجود مثنوی و غزل کی طرح صنف قصیدہ میں بھی شعرائے اردو نے زبانِ فارسی کے تتبع کا حق ادا کر دیا ہے اور اردو میں فارسی طرز و انداز کے قصائد کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وصفِ خاص میں کوئی دوسری زبان اردو کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی لائقِ ذکر ہے کہ قصیدہ گو شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اظہارِ فضل وکمال کے لیے مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کا فن کارانہ استعمال کرے۔ اردو کے قصیدہ نگار شعرا نے اس کا بھی پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس ضمن میں ذوقؔ، مومنؔ، منیرؔ شکوہ آبادی اور اقبال سہیلؔ کے قصائد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منیرؔ کا ایک قصیدہ ''در منقبتِ حضرت حسنؑ'' ہے۔ بہ قول ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ اس کی تشبیب غروبِ آفتاب، رات کی کیفیات اور علم نجوم کے مطابق ستاروں کی حرکات وسکنات وغیرہ سے متعلق ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن / غرق ہوا چاہ میں یوسفِ گل پیراہن
آبلۂ روز پہ تازہ حنا بندھ گئی / ابروے زالِ زری نعلِ کمیتِ کہن
چاہِ سیہ میں گرا یوسفِ رنگیں قبا / دیوِ سیہ ہو گیا شاہدِ پرویں پرن
مالِ شہِ نیم روز بسکہ ہوا کم بہا / زنگیوں کے بال سے بدلی سنہری کرن
خیمۂ زرباف میں لیلیِ مشکیں لباس / زینتِ فانوسِ سبز شمعِ مرصّع لگن
پنجۂ کف الخضیب شانۂ گیسوے شب / سرمۂ چشمِ نجوم مشکِ غزالِ ختن
گنبدِ فیروزہ میں چھوڑ کے تابوت کو / دخترِ کانِ یتیم پھرنے لگیں خندہ زن
لالۂ داغِ پلنگ تھی شفق آسماں / دیکھ کر اوج رقیب کبک ہوا سینہ زن
خسروِ اقلیم چیں قصرِ ششم میں مکیں / ہندوے بالانشیں صرفِ بت و برہمن
ترکِ کماندار نے تیر کیا زیبِ قوس / زینتِ دستِ سماک نیزۂ خارا شکن

منیرؔ نے یہ قصیدہ جزیرۂ انڈمان میں قیدِ فرنگ کے دوران لکھا تھا۔ اس کے آخر میں انھوں نے اس قصیدے کے منشاے تصنیف کا قدرے تفصیلی بیان کیا ہے، جو موقع ومحل کی مناسبت سے یہاں نقل کیے جانے کے لائق ہے۔ کہتے ہیں:

اب سنیں یہ التماس نکتہ رسانِ فہیم / شاعرِ اردو زباں، واقفِ رازِ کہن
عذرِ صحیح وقوی پھر میں کروں گا مگر / میری خطا بخش دیں پہلے سب اہلِ سخن
شاعروں میں بے مثال، سحر بیاں فاخرؔ / مادحِ سلجوقیاں، نامیِ عہدِ کہن
پہلے قصیدہ کہا اس نے ہے اس طرز میں / پھر ہوئے صرفِ جواب بعض سرانِ سخن
لہجۂ اردو میں یہ طرز نہیں ہے پسند / جبر سے اس کوچے میں بندہ ہوا گامزن
مخزنِ عقل وکمال، عالمِ عالی مقام / ناقدِ تازی زباں، نبض شناسِ سخن
مولویِ بے نظیر، فضلِ حق اسمِ شریف / دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و مؤتمن
قید میں میں اور وہ دونوں تھے اِک ہی جگہ / عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن
کہنے لگے ایک دن کچھ سبب اس کا بتا / شاعرِ اردو زباں، اس میں ہوں نو یا کہن

مصطلحاتِ عجم اورکنایاتِ فُرس　　کس لیے کرتے نہیں زینتِ نظمِ سخن
یا متحمّل نہیں لہجۂ اردو زباں　　یاکوئی لائق نہیں تم میں سے بے ریب وظن
گوکہ غزل میں نہ ہو پر ہے قصیدے میں فرض　　دقّتِ مضمون سے حُسن بہ وجہِ حَسن
حضرتِ سودؔا بغیر کس نے قصیدے کہے؟　　وہ بھی پر اس راہ میں ہو نہ سکے قطرہ زن
شاعروں میں جُز غزل پھر نہ کسی نے کہا　　زعم میں گو اپنے ہوں طوطیِ شکّر شکن
میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں　　آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محَن
مصطلحاتِ غریب جو کہ نہ معروف ہوں　　نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے　　اس کو بھی سُن سُن کے آج، ہوتے ہیں سب طعنہ زن
کہنے لگے: ''یہ کلام مہمل و بے مغز ہے　　ہیں شعرا بے سواد، جہل ہے ان کا وطن''
گرم ہوئے، بڑھ گیا سلسلۂ قہر و خشم　　بسکہ تھے نازک مزاج، ماتھے پہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار: ''ہندیوں سے ہے محال　　رمز و کنایات میں دقّت و لطفِ سخن''
ہوکے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا　　کوچۂ نَو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحطِ کتاب، حافظہ از بس ضعیف　　پھر مددِ غیب سے خامہ ہوا حرف زن
بعض تراکیب خاص طبع کے ایجاد ہیں　　نظم ہوئیں جو کہ تھیں یاد مصطلحاتِ کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم　　ختم ہوا جب وہ تھے ہمدمِ گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحب انصاف عفو　　قید میں مَیں خود ہوں پوچ، پوچ ہے میرا سخن
غیب سے تاریخ نو ہاتھ لگی اے منیرؔ　　جزوِ دل و جاں ہوئی شرحِ حدیثِ کہن

۱۲۷۹ھ

ان اشعار سے ایک طرف یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اہلِ علم اور اربابِ نظر کی نگاہ میں قصیدہ کس طرح غزل سے مختلف تصور کیا جاتا تھا اور دوسری جانب یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اردو شعرا نے شعراے فارسی کے تتبع میں کیسی کیسی کاوشیں کی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اردو قصائد کا باقاعدہ مطالعہ اور ان کی باضابطہ تدریس کلاسیکی علوم و فنون سے ہماری فی الجملہ واقفیت اور تہذیبی شناخت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری کی روایت اور مختلف قصیدہ نگار شعرا کی قدر و قیمت کے تعیُّن کے سلسلے میں سب سے عمدہ اور مثالی کام ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کا ہے۔ اسی طرح اردو قصائد کا بہترین انتخاب ڈاکٹر سحرؔ کا مرتبہ انتخاب قصائدِ اردو مع مقدمۂ و حواشی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ حالی،الطاف حسین، ۲۰۰۳ء،مقدمہ شعر و شاعری،اتر پردیش اردو اکادمی،(عکسی ایڈیشن)،لکھنؤ،ص ۷۷۔۷۸

۲۔ اثر،امداد امام،کاشف الحقائق،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،ص ۴۹۹

۳۔ سحر،ابو محمد،سن ندارد،اردو میں قصیدہ نگاری،تخلیق کار پبلی شرز،دہلی،ص ۶۲۔۲۶۱

۴۔ عسکری،حسن،۲۰۰۰ء،فلیپ،مجموعہ محمد حسن عسکری،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور

۵۔ ابن منظور،لسان العرب،جلد سوم،ص ۳۳۵

۶۔ ایضاً،ص ۳۳۶

۷۔ قزوینی،مرزا محمد خان،۱۳۳۶ء،بیست مقالہ قزوینی،تہران،چاپ دوم،جلد اول،ص ۵۷

۸۔ بدر الجاجرمی،محمد بن،۱۳۳۷،مونس الاحرار فی دقائق الاشعار،تحقیق محمد قزوینی،ایران

۹۔ نعمانی،علامہ شبلی،۲۰۰۹ء،شعر العجم،حصہ پنجم،دار المصنفین،اعظم گڑھ،طبع جدید،ص ۲۹

۱۰۔ احمد،نذیر،پروفیسر،۱۹۹۱ء،پیش لفظ،مشمولہ:'فارسی قصیدہ نگاری' پروفیسر نذیر احمد،ادارۂ علوم اسلامیہ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،،ص ۴

۱۱۔ ایضاً،ص ۸۔۷

Abstract

This article explains the importance of qasida, a classical genre of Urdu, Persian and Arabic poetry. The article writer claims that Abu Muhammad Sahr has unrivalled reputation in doing tremendous job about the genre in Urdu.In the article, the article contains information about qasida in Arabic language and its principles. The genre of qasida in Persian was initially influenced by the Arabic language and later on the Persian poets experimented in the form. The article contains a detailed account titled, monisul ahrar fi daqaiqul ashaarby Muhammed bin Badr Ja Jarmi who compiled the works of 187 poets of qasida in his work for which he wrote 14 chapters carefully divided with reference to their topics and beauty of their expression.

Keywords: classical genre of qasida, Urdu qasida, Persian qasida, Arabic qasida, Muhammed bin Badr Ja Jarmi, monisul ahrar fi daqaiqul ashaar